© rasailojaraid.com

دہشت گردانہ طرزِ فکر کے مغالطے اور ان کی وضاحت

ڈاکٹر شیخ عبد الرحمٰن السدیس حفظہ اللہ
امام کعبہ ، چیئرمین ڈائریکٹوریٹ حرمین شریفین ، مکہ

فضیلۃ الشیخ امام کعبہ حفظہ اللہ اپنی عظیم دینی ذمہ داری کے ساتھ سعودی حکومت میں بڑے اہم منصب 'حرمین شریفین کے ڈائریکٹوریٹ کے چیئرمین' کی ذمہ داری بھی ادا کر رہے ہیں۔ اس بنا پر آپ کی زیر نظر تحریر میں شریعتِ اسلامیہ کے ساتھ ساتھ سعودی حکومت کے موقف کی ترجمانی کا پہلو بھی ہے جو وہ دہشت گردی کے تناظر میں پیش نظر رکھتی ہے۔ مغالطوں کی وضاحت کے دوران اس اہم پہلو کو بھی ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ ادارہ

گزشتہ شمارے میں دہشت گردی کا مفہوم اور اس کے اسباب کے بارے میں تفصیل گزری، اب یہاں ہم دہشت گردانہ فکر کے شبہات کی تردید پر گفتگو کریں گے جس کی وجہ سے وہ بڑے ہولناک جرائم میں ملوث ہو گئے۔ ان کے شبہات کی وضاحتیں ملاحظہ فرمائیں۔

پہلا شبہ: حاکم وقت کی تکفیر

اس بے جان شبہ اور ان کی لاعلمی کی بنیاد پر حکام کے خلاف خروج کے فتنے نے جنم لیا اور انہیں اللہ تعالیٰ کے اس قول کو سمجھنے میں غلطی لگی:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۴۴ ﴾ (المائدۃ: ۴۴)

''جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں۔''

اہل علم نے اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں سیدنا عبد اللہ بن عباس ؓ کا یہ مشہور قول ذکر کیا ہے کہ

''اس آیت میں مذکور کفر سے وہ کفر مراد نہیں جو ایک انسان کے خون و مال کو حلال کر دے، بلکہ یہ اس سے کمتر کفر ہے۔''[1]

1 تفسیر ابن کثیر: ۳/ ۱۱۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تکفیر کی شرائط

لہٰذا انسان کو چاہیے کہ تکفیر سے باز رہے اور مندرجہ ذیل اہم شرطوں کے پائے جانے کے بعد ہی اس کی جرات کرے:

پہلی شرط: نصوص اس بات پر دلالت کریں کہ یہ چیز کفرِ اکبر اور ملت سے خارج کرنے والی ہے۔

دوسری شرط: حکم اسی شخص پر لاگو ہوتا ہو جس پر حکم لگانا مقصود ہو۔

تیسری شرط: وہ کلمۂ کفر صریحاً کفر ہو۔

اس کے علاوہ ان شرائط وضوابط کا بھی خیال ضروری ہے جو پہلے ذکر ہو چکی ہیں۔

اس لیے تکفیر کا حکم لگانے والے شخص کے لیے لازمی ہے کہ اسے شریعت کے قواعد و اصول کا علم اور نصوص کے مابین جمع و تطبیق کی صلاحیت ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ نصوص کے مقتضی سے وہ یہ واضح کر لے کہ یہ ملت سے خارج کرنے والا کفر ہے یا نہیں؟ یہ چیزیں اس کفر سے متصف شخص کی حالت پر غور و فکر کرنے کے بعد طے کرے کہ آیا اس شخص کے حق میں تکفیر کی شرطیں پوری ہو رہی ہیں یا نہیں؟ ان اہم چیزوں کا اس نازک مسئلے میں اعتبار کرنا ضروری ہے۔

تکفیر کے موانع

تکفیر چونکہ شرعی حکم ہے، اس لیے اس میں شرائط کا پایا جانا اور موانع سے خالی ہونا ضروری ہے۔ تکفیر کی شرائط بیان کرنے کے بعد بہتر یہ ہے کہ اس کے موانع بھی ذکر کر دیے جائیں۔ چنانچہ سب سے پہلے اس شخص کی طرف کفر کی نسبت کی تحقیق کر لی جائے اور وہ خود بھی اس کفر کا اقرار کرے، اس پر حجت قائم کی جائے اور اسے اس کے بارے میں پورا اختیار اور مہلت دے کیونکہ بسا اوقات کفر کے مرتکب شخص میں درج ذیل تین موانع میں سے کوئی ایک مانع پایا جاتا ہے:

۱۔ جہالت: بسا اوقات کفر کا مرتکب شخص جاہل ہوتا ہے اور اسے مسئلے میں شرعی حکم سے واقفیت نہیں ہوتی۔

۲۔ تاویل: بسا اوقات وہ تاویل کرتا ہے اور معاملے کو ایسے حکم پر محمول کرتا ہے جو صحیح شرعی حکم نہیں ہوتا۔

۳۔ اکراہ: کبھی وہ مجبوراً اس فعل کا مرتکب ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے:

﴿إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ﴾ (النحل:۱۰۶)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"مگر جس شخص کو مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو (تو کوئی حرج نہیں)۔"[1]

سلف کے نزدیک تکفیر کے یہ تین موانع ہیں، اس لیے کسی شخص کا مؤاخذہ اس کے گناہ کی وجہ سے نہیں کیا جائے گا مگر بعد اس کے کہ اس کے سامنے حجت واضح کر دی جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا﴾ (بنی اسرائیل:۱۵)

"اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ (لوگوں کو حق و باطل کا فرق سمجھانے کے لیے) ایک پیغمبر نہ بھیج دیں۔"

اللہ تعالیٰ کا ایک اور ارشاد ہے:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا﴾ (القصص:۵۹)

"اور تیرا ربّ بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا۔"

ابو واقد لیثیؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب خیبر کی طرف نکلے تو راستے میں مشرکین کے ایک درخت کے پاس سے گزرے جسے 'ذاتِ انواط' کے نام سے جانا جاتا تھا، اس پر وہ لوگ اپنے ہتھیار لٹکایا کرتے تھے، تو صحابہ کرام نے کہا: اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے لیے بھی ایک 'ذاتِ انواط' مقرر دیجیے جس طرح ان کے لیے ذاتِ انواط ہے۔ تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«سُبْحَانَ اللهِ هٰذَا كَمَا قَالَ قَوْمُ مُوسَى: ﴿اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ﴾ (الأعراف: 138) وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَرْكَبُنَّ سُنَّةَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ»[3]

"سبحان اللہ! یہ تو وہی بات ہوگئی جس طرح موسیٰ کی قوم نے ان سے کہا" آپ ہمارے لیے بھی ایک معبود بنادیں جس طرح ان کے لیے ایک معبود ہے۔" قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم لوگ ضرور اپنے سے پہلے لوگوں کے طریقے پر چلو گے۔"

تکفیر کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ بہت زیادہ اس بات سے ڈرے کہ کہیں وہ ایسے شخص کی تکفیر نہ کردے جس کی تکفیر اللہ اور اس کے رسول نے نہیں کی، ورنہ وہ حکم خود اسی پر لوٹ آئے گا، اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

---

۱ تفسیر ابن کثیر: ۲۰۵/۶

۲ شروط التکفیر و موانعہ: مجموع الفتاویٰ: ۶/۵۸، ۱۲/۴۸۹

۳ سنن ترمذی، کتاب الفتن، باب ماجاء لترکبن سنن من کان قبلکم، حدیث ۲۱۸۰، امام ترمذی: حدیث حسن صحیح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

«أَيُّمَا امْرِئٍ قَالَ لِأَخِيهِ "يَا كَافِرُ!" فَقَدْ بَاءَ بِهَا أَحَدُهُمَا. إِنْ كَانَ كَمَا قَالَ وَإِلاَّ رَجَعَتْ عَلَيْهِ»[1]

"جس نے بھی اپنے کسی بھائی کو 'اے کافر' کہہ کر بلایا تو ان دونوں میں سے کوئی ایک ضرور کافر ہو جاتا ہے۔ اگر واقعی مسئلہ ویسا ہی ہے جیسا اس نے کہا تب تو ٹھیک ہے، ورنہ یہ کفر اسی پر لوٹ آتا ہے۔"

امام غزالی[2] فرماتے ہیں:

"جہاں تک ہو سکے انسان کو تکفیر سے احتراز کرنا چاہیے، کیونکہ قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے والے اور صراحۃً لا إله إلا الله محمّد رسول الله کہنے والے کے خون اور مال کو حلال سمجھنا ایک غلطی ہے اور ایک ہزار کافروں کو زندگی بخشنے میں غلطی کرنا اس بات سے زیادہ آسان ہے کہ کسی مسلمان کے خون بہانے میں غلطی کی جائے۔"[3]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

"یہی وجہ ہے کہ اہل علم و سنت اپنے مخالفین کی تکفیر نہیں کرتے، اگرچہ ان کے مخالفین ان کی تکفیر کرتے ہیں، کیونکہ کفر ایک شرعی حکم ہے اور کسی انسان کے لیے یہ روا نہیں ہے کہ اس کی مثل کے ذریعے بدلہ لے۔"[4]

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تکفیر ایک حکم شرعی ہے جس میں شرائط کا یقینی طور پر پایا جانا اور موانع سے خالی ہونا ضروری ہے۔

دوسرا شبہ: حکام کے خلاف خروج کو جائز سمجھنے کا شبہ

اہل تکفیر کے بے سروپا شبہات میں سے، جن کی بنا پر وہ شرمناک افکار کا شکار ہوئے، ایک ظالم حاکم کے خلاف خروج کو جائز سمجھنا بھی ہے۔ اپنے زعم سے اس جواز کی دلیل انہوں نے یہ پیش کی کہ اس مسئلے میں سلف کے مابین اختلاف تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلے میں سلف کے مابین اختلاف اس وقت تھا جب کہ خروج

1 صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من أكفر أخاه بغير تاويل فهو كما قال، حدیث نمبر ۵۷۵۳،
صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان حال إيمان من قال لأخيه المسلم يا كافر!، حدیث نمبر ۶۰

2 ابو حامد محمد بن محمد طوسی غزالی، لقب: حجۃ الاسلام ہیں۔ (ولادت طوس ۴۵۰ھ۔ وفات مصر ۵۰۵ھ) ان کی تقریباً دو سو تصنیفات ہیں، جن میں 'احیاء علوم الدین'، 'تہافت الفلاسفہ'، 'الاقتصاد فی الاعتقاد'، 'المستصفی من علم الاصول' وغیرہ مشہور ہیں۔

3 'الاقتصاد فی الاعتقاد': ۱۷۶، طبع: دار قتیبہ

4 'الرد علی البکری' از ابن تیمیہ: ۲/۴۹۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے نقصانات کھل کر ان کے سامنے نہیں آئے تھے، لیکن جب اُنہوں نے دیکھ لیا کہ خروج کوئی بھلائی نہیں لاتا تو وہ حکامِ وقت کے خلاف خروج ترک کرنے پر متفق ہو گئے، اگرچہ حکام ظلم وزیادتی کریں۔

امام بخاری کے عقیدہ کا ذکر کرتے ہوئے امام لالکائی اپنی سند سے امام بخاری سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

> ''میں نے حجاز، مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، واسط، بغداد، شام و مصر کے ایک ہزار سے زائد اہل علم سے ملاقات کی، میں ان سے متعدد بار وقتاً فوقتاً ملتا رہا، چھیالیس سالوں سے زائد عرصہ سے میں نے ان کو ان کی زندگی میں پایا ہے۔ کئی سالوں میں شام، مصر اور جزیرہ والوں سے دو مرتبہ اور بصرہ والوں سے چار مرتبہ ملا، حجاز میں چھ سال اور کوفہ و بغداد نہ جانے کتنی بار گیا جس کا کوئی شمار نہیں، خراسان کے محدثین کے ساتھ ملا، جن میں...'' پھر انہوں نے ان میں سے بعض ناموں کا ذکر کیا، پھر بعض اعتقادی مسائل کا ذکر کیا اور اسی ضمن میں امام بخاری کا یہ قول بھی نقل کیا: '' وألّا ننازع الأمر أهله. کہ ہم حکمرانوں سے ان کی حکومت پر نہ لڑیں، وألّا یری السیف علی أمته محمد ﷺ. اور یہ کہ امّت محمد یہ ﷺ کے خلاف تلوار نہ اٹھائیں۔''[1]

اسی طرح لالکائی نے اپنی سند سے امام ابن ابی حاتم رازی[2] رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے والد اور ابوزرعہ رحمہما اللہ کے عقیدہ کا تذکرہ نقل کیا ہے کہ اُنہوں نے کہا:

> ''میں نے اپنے والد سے اور ابوزرعہ سے اُصولِ دین میں اہل سنت کے عقیدے کے بارے میں پوچھا اور یہ کہ تمام ممالک میں علما کو کس منہج پر پایا؟ تو ان دونوں نے کہا: ہم نے حجاز، عراق، شام اور یمن جیسے تمام ممالک میں علما کو پایا۔ ان کا عقیدہ یہ تھا... پھر بہت سارے اُمور کو ذکر کیا، جن میں ایک مسئلہ یہ تھا: اور ہم اماموں (حکمرانوں) کے خلاف خروج کو جائز نہیں سمجھتے اور نہ ہی فتنہ کے زمانے میں قتال کو جائز سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے جس کو ہمارے معاملات کا ذمہ دار بنا دیا ہے، ہم اس کی سمع وطاعت کرتے ہیں، اس کی اطاعت سے ہاتھ نہیں کھینچتے، سنت اور جماعت کا اتباع کرتے اور شذوذ، اختلاف اور تفرقہ سے بچتے ہیں۔''[3]

---

1 شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ: ۲/ ۱۹۳ تا ۱۹۷، نمبر ۳۲۰

2 ابوحاتم محمد بن ادریس بن منذر غطفانی حنظلی الرازی، حافظ المشرق، اسماء الرجال کے ماہر و مرجع۔ امام زہری کی احادیث کے جامع و مرتب (وفات ۲۷۵ھ)

3 شرح اصول اعتقاد اہل السنۃ: ۲/ ۱۹۳ تا ۱۹۷، نمبر ۳۲۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امام نووی رحمہ اللہ صحیح مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں:

''اور جہاں تک مسئلہ ان (حکام وقت) کے خلافت خروج کرنے اور ان سے قتال کرنے کا ہے تو یہ تمام مسلمانوں کے اجماع سے حرام ہے، اگرچہ وہ فاسق اور ظالم ہوں۔ جو میں نے ذکر کیا ہے اس معنیٰ کی حدیثیں واضح اور ظاہر ہیں۔'' پھر لکھتے ہیں:

''قاضی نے کہا: ابو بکر بن مجاہد نے اس مسئلہ میں اجماع کا دعوی کیا ہے اور کچھ لوگوں نے یہ کہتے ہوئے ان کا رد کیا ہے کہ حضرت حسین، ابن زبیر رضی اللہ عنہما اور اہل مدینہ بنی اُمیہ کے خلاف کھڑے ہوئے، اسی طرح تابعین اور دور اوّل کے مسلمان ابن اشعث کے ساتھ مل کر حجاج کے خلاف کھڑے ہوئے۔ پھر لکھتے ہیں: قاضی نے کہا: ''کہا گیا کہ یہ اختلاف شروع دور میں تھا، پھر ان کے خلاف خروج نہ کرنے پر اجماع ہو گیا۔''[1]

شاذونادر ہی کوئی ایسا امام ملے گا کہ جس نے اہل سنت کے عقیدہ پر کوئی کتاب لکھی ہو مگر اس نے ضرور بیان کیا کہ حکامِ وقت کے خلاف خروج نہ کیا جائے، اگرچہ وہ ظلم وزیادتی کریں اور معروف (بھلے کام) میں ان کی سمع وطاعت بجالائی جائے اور اُنہوں نے اس چیز کو اپنے اصول میں شمار کیا اور جو اس مسئلے میں ان کی مخالفت کرتا ہے تو وہ ہویٰ پرست وبدعتی ہے اور جماعت سے نکلنے والا ہے۔

علامہ ابوالحسن اشعری[2] رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کے اماموں (حکمرانوں) کی سمع وطاعت پر علما کا اجماع ہے اور اس بات پر بھی کہ ہر وہ شخص جو ان کے کسی معاملے کا والی بنا خواہ رضامندی کے ساتھ یا زبردستی اس کی حکومت قائم ہو گئی۔ خواہ وہ نیک ہو یا فاجر تو اس کے خلاف تلوار کے ذریعہ خروج نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ظلم کرے یا عدل کرے۔''[3]

علامہ ابو بکر اسماعیلی[4] رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''علما کی رائے یہ ہے کہ ان ظالم حکمرانوں کے لیے اصلاح کی دعا کی جائے اور اس بات کی کہ وہ عدل کی

---

۱ شرح مسلم از نووی: ۲/ ۴۳۳، ۴۳۲

۲ ابوالحسن علی بن اسمٰعیل اشعری، مصنف: مقالات الاسلامیین، الإبانة عن أصول الديانة (وفات: ۳۲۴ھ)

۳ رسالة إلى أهل الثغر، ص۲۹۷

۴ ابو بکر احمد بن ابراہیم اسماعیلی شافعی، امام اہل جرجان، مصنف: المستخرج علی الصحیح، المعجم، مسند عمر، المسند الکبیر (وفات ۳۷۱ھ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طرف مائل ہوں۔ اوران کے خلاف تلوار سے خروج کو جائز نہیں سمجھتے۔"[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"دیے گئے علم وعدل کا تقاضا یہ ہے کہ حکام کے ظلم وجور پر صبر کیا جائے، جیسا کہ یہ اہل سنت والجماعت کا اُصول ہے۔"[2]

پھر انہوں نے ایک طویل گفتگو کی، جس میں اُنہوں نے فرمایا:

"اسی لیے اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہو گیا ہے کہ فتنہ کے زمانے میں قتال نہ کیا جائے کیونکہ اس سلسلے میں نبی ﷺ سے صحیح احادیث ثابت ہیں، وہ اس مسئلے کو اپنے عقائد میں ذکر کرتے ہیں اور حکام کے ظلم پر صبر کرنے اوران سے قتال نہ کرنے کا حکم دیتے ہیں، اگرچہ فتنہ کے زمانے میں اہل علم ودین کی بڑی تعداد نے قتال کیا ہے۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے یہ فرمایا: نبی ﷺ نے کسی کی تعریف نہیں کی، نہ فتنہ میں قتال کرنے پر، حکام کے خلاف خروج کرنے پر، ان کی اطاعت سے ہاتھ کھینچنے پر اور نہ ہی جماعت سے الگ ہونے پر۔"[3]

پھر انہوں نے حکام وقت کے خلاف خروج کے نقصانات کا فوائد کی نسبت بھاری ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"اسی لیے اہل حدیث کا منہج یہ ہے کہ ظالم بادشاہوں کے خلاف قتال کے ذریعہ خروج نہ کیا جائے، ان کے ظلم پر صبر کیا جائے تا آنکہ نیک شخص کو راحت مل جائے یا فاجر سے نجات مل جائے۔"

اُنہوں نے یہ بھی فرمایا:

"اسی لیے اہل سنت والجماعت کے اصولوں میں سے یہ رہا کہ جماعت کو لازم پکڑا جائے، حکام سے قتال نہ کیا جائے اور فتنہ کے زمانے میں قتال سے باز رہا جائے۔ اور جہاں تک ہوی پرستوں کا مسئلہ ہے جیسے معتزلہ تو حکام کے خلاف قتال کو جائز سمجھنا ان کے اُصولِ دین میں شامل ہے۔"[4]

اُنہوں نے یہ بھی فرمایا:

"جہاں تک اہل علم وفضل اور دین کا مسئلہ ہے تو وہ کسی کو بھی حکام وقت کی نافرمانی کرنے، انہیں دھوکہ

---

۱ اعتقاد أہل السنۃ، ص ۵۰

۲ مجموع الفتاوی: ۲۸/ ۲۷۹

۳ مجموع الفتاوی: ۴/ ۵۲۷ تا ۵۳۰

۴ مجموع الفتاوی: ۴/ ۴۴۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دینے اوران کے خلاف کسی بھی نوعیت کے خروج کرنے کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے، جیسا کہ متقدمین ومتاخرین اہل سنت اور دیگر لوگوں کی عادات اور کردار سے یہ بات معروف ہے۔"[1]

انہوں نے یہ بھی فرمایا:

"اس سلسلے میں اصول یہ ہے کہ کسی امام یا گروہ کے اندر صرف ظلم وزیادتی کا پایا جانا اس سے قتال کا موجب نہیں ہے، بلکہ جواز بھی فراہم نہیں کرتا۔ اس کے برعکس جس اصول پر نصوص دلالت کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس بات کا حکم دیا جائے گا کہ وہ ظالم وجابر بادشاہ کے ظلم وجور اور زیادتی پر صبر کریں اوراس سے قتال نہ کریں۔"[2]

ان روشن نصوص و براہین سے سارا ابہام و غموض دور ہو جاتا اور شبہ زائل ہو جاتا ہے اور اس جاہل فکر کا عیب واضح ہو جاتا ہے جو حکام کے خلاف خروج جائز قرار دیتی ہے اور اُمتِ مسلمہ کو کشمکش، اختلاف، انتشار اور تباہی کی آگ میں جھونک دیتی ہے۔[3]

تیسرا شبہ: ہاتھ اور ہتھیار سے منکر کو بدلنے کا شبہ

امر بالمعروف و نہی عن المنکر شریعت کے اُصولوں میں سے ایک عظیم ترین اصول ہے، اسی سے شریعت کے ارکان مضبوط ہوتے ہیں، اس کی عمارت بلند ہوتی ہے اور اسی سے اُمتِ مسلمہ کو 'خیر امت' کا درجہ ملا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ﴾

"تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔" (آل عمران: ۱۱۰)

اس عظیم دینی شعار کے کچھ شروط، آداب و ضوابط اور مقاصد ہیں جنہیں مکمل طریقہ سے پورا کرنا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس سلسلے میں وارد نصوص کو سب سے درست معنی اور سب سے پاکیزہ فہم پر محمول کیا جائے، ان کی پریشانی اس شعار کے تئیں ان کی کمزور سوچ اور الٹے قول کی وجہ سے ہے جو کھلم

---

۱ مجموع الفتاوی: ۱۲/۳۵/۵

۲ الاستقامہ: ۱/ ۳۲ اور منہاج السنۃ: ۳/ ۳۹۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھلا روشن شرعی احکام کے مخالف ہے، جس کی چند مثالیں ذیل میں بیان کی جا رہی ہیں:

انہوں نے اللہ کے رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کو غلط ڈھنگ سے سمجھا:

«مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ» وفي رواية: «وَلَيْسَ وَرَاءَ ذَٰلِكَ مِنَ الْإِيمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ»[1]

"تم میں سے جو بھی کسی منکر کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدلے، اگر اس کی طاقت نہ ہو تو اپنی زبان سے اسے بدلے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو اسے اپنے دل میں برا جانے اور یہ سب سے کمتر ایمان ہے۔" ایک دوسری روایت میں ہے: "اور اس کے بعد ذرہ برابر بھی ایمان نہیں ہے۔"

ان کو یہ جواب دیا جائے گا کہ اپنی جانب سے چیزوں کو ان کے حقیقی نام کو چھوڑ کر ایسا نام نہ دیا جائے جو فساد کا باعث ہو یا شریعت کے مخالف ہو۔ ایسا کرنا نہ اہل علم کا قول ہے، نہ اہل فضل کا عمل ہے، نیز اللہ نے جن لوگوں کو دین میں بصیرت سے نوازا ہے، ان کے ہاں یہ چیز حقیقت کو کچھ بھی بدل نہیں سکتی، کیونکہ جلیل القدر علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایسا منکر جو اپنے سے بڑے منکر کو جنم دے، اس کی نکیر نہیں کی جائے گی، کیونکہ شریعت کی بنیاد اس بات پر ہے کہ مصلحتیں حاصل کی جائیں اور مفاسد کم کیے جائے۔

اس پر قد آور علمائے کرام کے اقوال دلالت کرتے اور ابھارتے ہیں چنانچہ

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے:

"اگر غالب گمان یہ ہو جائے کہ ہاتھ سے منکر کو بدلنے کی صورت میں اس سے بڑا منکر پیدا ہو جائے گا جیسے اس کے یا کسی اور کے قتل ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں ہاتھ سے روکنے کے بجائے زبان کے ذریعہ سے بات کہنے اور وعظ و نصیحت کرنے اور خوف پیدا کرنے پر اکتفا کرے۔ پھر اگر یہ ڈر ہو کہ زبانی نصیحت سے بھی اسی قسم کا خطرہ ہے تو پھر وہ اپنے دل سے برا جانے، اس طرح وہ وسعت میں رہے گا۔ یہی حدیث کا مفہوم ہے۔"[2]

واللہ! یہی مشکاۃ نبوت کے فہم سے پیدا ہونے والا نور ہے اور اللہ کی حرمتوں اور اس کے احکامات کے سلسلے میں پرہیز گاری اختیار کرنے کی راحت اور سکون ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

---

۱ صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۴۹

۲ شرح صحیح مسلم از نووی: ۱/۳۰۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''کسی منکر کا انکار کسی ایسے وسیلے سے کرنا جو اس سے بڑا منکر ہو، جائز نہیں ہے، اس لیے امر بالمعروف والنہی عن المنکر کی خاطر حکام کے خلاف تلوار لے کر نکلنے کو جرم قرار دیا گیا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے محرمات کے ارتکاب اور واجبات کے ترک کی ایسی برائی لازم آئے گی جو کہ حکام کی جانب سے صادر ہونے والے منکر اور گناہ سے کہیں بڑھ کر ہے۔''[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ

''ابو مطیع حکم بن عبد اللہ نے ان سے پوچھا: اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو بھلائی کا حکم دے اور منکر سے روکے، جس پر کچھ لوگ اس کے پیروکار بن جاتے ہیں اور پھر وہ جماعت کے خلاف خروج کرے، تو کیا آپ اس کو جائز سمجھتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: نہیں، میں نے کہا: کیوں جب کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے اور یہ واجب فریضہ ہے؟ تو اُنہوں نے فرمایا: بات تو صحیح ہے لیکن خون بہانے اور حرام کو حلال سمجھنے کی صورت میں جو بگاڑ وہ کریں گے، وہ ان کی اصلاح سے زیادہ ہو گا۔''[2]

علامہ ابن جوزی[3] رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''حکام و سلاطین کے ساتھ امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے سلسلے میں جو طریقہ درست ہے وہ یہ ہے کہ ان کو آگاہ کیا جائے اور انہیں وعظ و نصیحت کی جائے اور ایسے سخت الفاظ استعمال کرنا، مثلاً: اے ظالم! اے اللہ سے نہ ڈرنے والے! وغیرہ اس قسم کے الفاظ ایسا فتنہ بھڑکاتے ہیں جس کا شر دوسرے لوگوں تک پہنچتا ہے، تو جائز نہیں ہے۔ اور اگر کہنے والے کو صرف اپنے نفس پر خطرہ ہو تو جمہور علما کے نزدیک جائز ہے لیکن میں ایسا کرنے سے بھی منع کرتا ہوں، کیونکہ اصل مقصود منکر کو ختم کرنا ہے اور حاکم کے خلاف زبان درازی کر کے اسے منکر کے ارتکاب پر ابھارنا اس منکر سے بڑھ کر ہے جس کو اس نے زائل کرنے کا قصد کیا ہے۔''

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''حاکم سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی جائے گی، کیونکہ اس کی تلوار اور تازیانہ ہمیشہ تیار رہتے ہیں اور سلف

---

۱ مجموع الفتاوی: ۱۴/ ۴۷۲

۲ مجموع الفتاوی: ۵/ ۴۷

۳ امام عبد الرحمن بن علی بن محمد قرشی تمیمی بغدادی حنبلی ابن الجوزی، مختلف علوم میں متعدد تصانیف لکھیں۔ (وفات ۵۹۷ھ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے بارے میں جو یہ آتا ہے کہ وہ اپنے سلاطین کا سامنا کرتے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دل میں علما کی ہیبت تھی۔ اس لیے جب علما ان کے خلاف بولتے تھے تو اکثر حالتوں میں وہ انہیں انگیز کر لیتے تھے۔"[1]

ان دلائل و آثار سے ان کا شبہ ظاہر ہو گیا جس نے ان کے مفاسد اور باطل کو ان پر ملتبس کر دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ انتہا پسند جماعت نے پورے اصرار کے ساتھ اہل سنت والجماعت کے اجماع سے تصادم کیا ہے اور امر بالمعروف والنہی عن المنکر کے سلسلے میں ان کے حق اور درست منہج کی مخالفت کی ہے جس کی اصل و تفصیل اوّل و آخر اور باطن و ظاہر سراسر شفقت علم و حکمت اور بردباری پر مبنی ہے۔ کاش کہ یہ غلو پسند اور سنگ دل لوگ ان شفقت آمیز اُصول، اخلاق اور عمدہ خصلتوں اور اقدار کو تھوڑا بھی اپنائے ہوتے!!

چوتھا شبہ: آج دفاعی جنگ کا مرحلہ ہے جس کے لیے استطاعت کی کوئی شرط نہیں!

ان کے اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ عالمی نظاموں، بین الاقوامی عہد و پیمان اور معاہدوں کی موجودگی میں کس نے یہ طے کیا کہ اُمت آج دفاعی جہاد کے مرحلے میں ہے؟!! آیا اس مرحلے کا فیصلہ فقہ اکیڈمیوں اور اسلامی تنظیموں نے کیا یا ربانی علما نے کیا!!... یا یہ نو خیز کم علم اور عام لوگوں کا فیصلہ ہے!!

ہاں، یہ درست ہے کہ دفاعی جہاد شرعی واجبات میں سے ایک اہم واجب ہے اور دفاعی جہاد کا مطلب یہ ہے کہ کسی زیادتی و ظلم پر بطورِ بدلہ قتال کرنا، لیکن اس کی صحت اور وجوب کے لیے شرط ہے کہ یہ جہاد شرعی حکومت کی اجازت سے اور اس کے جھنڈے تلے ہو، نیز وہ قدرت واستطاعت سے مرتبط ہو اور اس بات سے بھی مرتبط ہو کہ یہ شر میں مزید اضافہ نہ کرے۔ اور اگر کوئی مسلمان کسی ایسے واجب کو ترک کر دیتا ہے جس کی قدرت اس کے پاس نہیں ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ کے یہاں وہ معذور ہو گا اور اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی سبیل نکالے گا، کیونکہ وہ اس سلسلے میں اللہ سے ڈرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ ﴾ (الطلاق:۲)

"جو کوئی اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔"

مزید فرمایا: ﴿ مَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝ ﴾ (الطلاق:۴)

[1] الآداب الشرعیۃ از ابن مفلح: ۱/۱۹۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"جو شخص اللہ سے ڈرے تو اللہ اس کے معاملہ میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔"

اسی طرح اگر علم کے حصول اور دعوت الی اللہ میں لگ جائے اور ہر آدمی اپنے اپنے میدان میں اپنی وسعت بھر اُمت کی طاقت کو دین کی خدمت کی جانب موڑ دے تو اس سے عمومی فائدہ ہوگا اور صحت مند سوچ پیدا ہوگی۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"جو شخص طاقت اور جہاد سے دین کو قائم کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور وہ کام کرتا ہے جس کی اسے قدرت ہے جیسے دل سے اُمت کے لیے خیر خواہی اور دعا، بھلائی سے محبت اور اپنی استطاعت بھر خیر کے کاموں کو انجام دیتا ہے تو اسے اس چیز کا مکلف نہیں کیا جائے گا جس کے کرنے سے وہ عاجز ہے کیونکہ دین کا قیام دو چیزوں سے ہے: ایک رہنمائی کرنے والی کتاب اور دوسری مدد کرنے والا لوہا (ہتھیار)۔"[1]

فضیلۃ الشیخ محمد بن صالح عثیمین رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں پر جہاد واجب ہے تاکہ اللہ کا کلمہ سربلند ہو اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے، لیکن آج مسلمانوں کے پاس وہ اسباب نہیں ہیں جن کے ذریعہ وہ کافروں سے جہاد کر سکیں، حتی کہ دفاعی جہاد بھی نہیں اور ہجومی جہاد تو بلاشک آج کے دور میں ناممکن ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ایک باشعور اُمت کو پیدا کرے جو پہلے ایمانی اور نفسیاتی طور پر تیار ہو، پھر عسکری طور پر جہاد کے لیے تیار ہو مگر ہم اس موجودہ صورتحال کی موجودگی میں جہاد نہیں کر سکتے۔"[2]

دفاعی جہاد کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ہمارے پاس دشمن کو روکنے کی طاقت ہو، اگر ہم طاقت اور ہتھیار میں ان سے کمتر ہیں اور پھر ہم ان کے طغیان و سرکشی کو بھڑکائیں اور اُنہیں اپنے وطن، اپنی عزت اور مال پر قبضہ جمانے کا موقع دیں، تو یہ جہاد نہیں ہے بلکہ یہ زمین پر فتنہ و فساد پھیلانے کے مترادف ہے اور ایسا کرنا واضح شریعت اور اس کے مسلمہ احکام کی خلاف ورزی ہے!!

پانچواں شبہ: کفار کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کا شبہ

اس شبہ کا جواب دینے سے پہلے اس مسئلے میں تھوڑی تفصیلی گفتگو کرنا بہتر ہے، وہ اس لیے کہ جزیرۃ العرب میں کافروں کے رہنے کی دو شکلیں ہیں: دائمی اور وقتی

---

۱ مجموع الفتاوی: ۲۸/ ۳۹۶

۲ من لقاء الخمیس: ۳۳، مجلس صفر ۱۴۱۴ھ منقول از 'مہمات فی الجہاد'، ص ۱۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دائمی قیام کرنا بایں طور کہ وہ اسے اپنا مستقل وطن بنالیں تو یہ جائز نہیں ہے اور اگر وقتی طور پر قیام کرتے ہیں تو جائز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ﴾

''اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کے (امن کی جگہ) تک پہنچا دو۔'' (التوبہ:٦)

اور اس لیے بھی کہ دونوں خلفاے راشدین حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے کفار کو جزیرۃ العرب سے نکالنے میں جلدی نہیں کی، نیز جس شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قتل کیا تھا اور اس سے اُن کو شہادت کا اعزاز ملا۔ وہ شہادت جس کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی، وہ کافر ہی تھا۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کا قصہ نقل کیا ہے، اسی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی ہے:

''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے کسی ایسے شخص کے ہاتھوں موت نہیں دی جو اسلام کا دعویٰ کرتا ہو۔''[1]

اس مسئلے میں ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ کفار کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کی ذمہ داری کس کی ہے؟

اس وقت پوری دنیا میں اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی بھی ملک میں اگر کوئی ایسا شخص داخل ہونا چاہتا ہے جو وہاں کا باشندہ نہیں ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس ملک کی حکومت سے اجازت حاصل کرے جسے ہم 'انٹری ویزا' کے نام سے جانتے ہیں، لہٰذا جو شخص بھی اس ویزا کے ساتھ کسی بھی ملک میں جاتا ہے تو اسے جان ومال کا امان حاصل ہوتا ہے اور اس کی خلاف ورزی اس شخص پر ناحق ظلم وزیادتی کرکے ہی ہوسکتی ہے۔

جو کفار جزیرۃ العرب میں داخل ہوئے ہیں، اُنہیں وہاں سے نکالنے کی ذمہ داری وہاں کے حکام کی ہے جن کی اجازت سے وہ وہاں داخل ہوئے ہیں، ان کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے لیے اس قسم کی کوئی کارروائی کرنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے حکومت کے امان میں آنے والے بعض لوگوں کے خلاف جو بھی ظلم وزیادتی ہوتی ہے، خواہ قتل کے ذریعے ہو یا ایذا رسانی کے ذریعے یا اس سے کمتر کسی حرکت کے ذریعے، تو یہ سب اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے اور جرم، زمین میں فساد پھیلانے اور اسلام و مسلمانوں کی شبیہ بگاڑنے کے قبیل سے ہے۔

اس کی مزید وضاحت اس بات سے ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دورِ حکومت میں صحابۂ کرام میں سے کسی نے کفار کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کو دلیل بنا کر کسی بھی کافر پر کسی قسم کی کوئی زیادتی

---

١ صحیح بخاری، کتاب فضائل الصحابۃ، باب قصة البيعة والاتفاق على عثمان بن عفان، حدیث نمبر ٣٤٩٧

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کی، نہ تو قتل کے ذریعہ اور نہ ہی اس سے کمتر کسی اور سرگرمی کے ذریعہ، کیونکہ وہ اس بات سے واقف تھے کہ ان کو نکالنے کی ذمہ داری حکامِ وقت کی ہے۔"[1]

اس مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جزیرۃ العرب سے مراد کیا ہے؟

اس سلسلے میں اہل علم کا اختلاف ہے، اس لیے اس مسئلے اور اس کے نتیجے میں امت کے اندر وجود پذیر ہونے والے بڑے بڑے مسائل میں فیصلہ کی ذمہ داری علمائے مجتہدین کی ہے نہ کہ عام افراد کی۔

جزیرۃ العرب کے امن و سکون اور اس میں فتنہ و فساد نہ برپا کرنے کے حوالے سے اگر شریعت کے مقاصد، جن میں مصالح کو حاصل کرنے، مفاسد کو روکنے اور انجام کا اعتبار کرنے کی دعوت ہے، کو مدنظر رکھا جائے تو صاف ظاہر ہو گا کہ ان دہشت گردانہ کارروائیوں کا انجام اس جزیرہ میں تخریب و تباہی اور خوف و دہشت کی شکل میں برآمد ہوا، جسے اللہ تعالیٰ نے امن و سلامتی اور صلاح و اصلاح کا گہوارہ بنانا چاہا، نہ کہ فتنہ و فساد کا اڈہ۔ اللہ عزوجل ہی سیدھے راستے کی رہنمائی کرنے والا ہے۔

مقصد ششم: عقیدہ وَلاء وبَراء میں غلط فہمی

عقیدے سے متعلق وہ شبہات جن میں دین سے بعید گروہ ملوث ہے اور اُنہوں نے اسے گمراہی، فتنے اور غلو کی دلدل میں دھکیل دیا ہے، ان میں سے ایک مسئلہ عقیدے کے ایک اہم اصول کے معانی سے ان کی جہالت و عدم واقفیت ہے۔ اور وہ ولاء وبراء کا عقیدہ ہے، جس نے ان دونوں کی حدود سے تجاوز کیا، وہ نہایت ہی مذموم غلو کا شکار ہوا۔ اسی طرح جس نے ان میں کوتاہی کی اس نے بھی حد سے تجاوز کیا اور تفریط کا شکار ہوا۔

انتہا پسند فکر کے حاملین نے اسلامی معاشرہ سے اپنی براءت کا اظہار کیا ہے اور اس کی تکفیر کی ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں مسلم معاشرہ کفار کے ساتھ لین دین کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ ان لوگوں کی جماعت سے نکل گیا ہے جس کے بارے میں ان کا زعم ہے کہ وہی دراصل مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جس کے بارے میں احادیثِ شریفہ میں ذکر آیا ہے حالانکہ

"یہ ان کے جھوٹ اور ان بناوٹی عقائد کا نتیجہ ہے جو انہوں نے گھڑ رکھے ہیں۔" (الاحقاف:۲۸)

ان کی اس باطل پرستی کی دھجیاں اُڑاتے ہوئے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اور جس شخص کے اندر ایمان اور فسق و فجور دونوں ہوں، اس کے ایمان کے بقدر اس سے دوستی رکھی جائے گی اور اس کے فسق و فجور کے بقدر اس سے بغض رکھا جائے گا اور محض گناہ اور معصیت کی وجہ

---

1 مجموع الفتاوی:۲۸/۸۹ اور بذل النصح والتذکیر لبقایا المفتونین والتفجیر :ص۱۸۔۱۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے اسے کلی طور پر ایمان سے نہیں نکالا جائے گا۔''[1]

ان کی لغزش اور کج فہمی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے کفر وولاء کا غلط مفہوم لیتے ہوئے فروعی احکام کو ولاء وبراء کا محل بنالیا ہے۔ خیر کے ایسے اعمال جنہیں شرعی اصول و مسلمات سے چھیڑ چھاڑ کیے بغیر دنیوی مصلحتوں کی خاطر اور امن وسلامتی کی راہیں ہموار کرنے کے لیے انجام دیا جائے، شریعت ان کی اجازت دیتی ہے اور ان کی خواہاں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْۤا اِلَيْهِمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۠ ۝ ﴾ (الممتحنہ:۸)

''اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں میں سے نہیں نکالا، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

اس آیت کا مفہوم یہ کہ کفار میں سے جن لوگوں نے مسلمانوں کو تکلیف نہیں پہنچائی، نہ ان سے قتال کیا اور نہ اُنہیں ان کے گھروں سے نکالا، مسلمان ایسے لوگوں کے ساتھ دنیوی معاملات میں احسان اور عدل وانصاف کا برتاؤ کریں گے، کیونکہ صلہ رحمی اور حسن تعامل کافر کو اسلام میں راغب کرنے کا ذریعہ ہے، لیکن قلبی محبت اور دوستی نہ ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے:

﴿ وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ﴾ (الانفال:۶۱)

''اور اے نبی! اگر دشمن صلح وسلامتی کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو۔''

دنیوی اُمور میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ کرنے کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں، مثلاً ہجرت کے موقع پر نبی ﷺ نے عبد اللہ بن اُریقط لیثی کو رہبر کے طور پر اُجرت پر رکھا تاکہ وہ راستہ کی رہنمائی کرے۔[2] اسی طرح آپ ﷺ نے بعض یہودیوں سے قرض لیا ہے۔ نبی ﷺ کی وفات کے وقت آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس گروی رکھی ہوئی تھی[3]، اسی طرح نبی کریم ﷺ اپنے یہودی پڑوسی کو ہدیہ دیا کرتے تھے۔

---

۱ مجموع الفتاویٰ: ۲۸/ ۲۲۷تا۲۲۹

۲ صحیح البخاری، کتاب الإجارة، باب استئجار المشركين عند الضرورة إذا لم يوجد أهل الإسلام، حدیث ۲۲۶۳

۳ السنن الکبریٰ از بیہقی، کتاب البیوع، باب جواز الرهن، حدیث نمبر ۱۰۹۷۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کے ساتھ بھی معاملہ طے کیا کہ جو بھی غلہ اور پھل ہو گا، اسکا آدھا دینا ہو گا۔[1]

یہ تمام چیزیں اس بات کی دلیل ہیں کہ خرید و فروخت اور منافع کے تبادلے میں غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ جائز ہے، چنانچہ ہم کفار کے ساتھ ان چیزوں میں خرید و فروخت کا معاملہ کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے، مثلاً: اشیائے خورونوش، کپڑے، اسلحہ اور اس کے علاوہ وہ نفع بخش اشیا جو مسلمانوں کے حق میں مفید ہیں، یہیں سے محض دنیوی تعامل اور عقیدے کی محبت اور دوستی کے درمیان فرق بھی واضح ہو جاتا ہے جس سے پختہ کار اہل علم بخوبی واقف ہیں، لیکن یہ جہالت، غلو اور نفس پرستی ہے جو ان چیزوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ پر، انہوں نے فرمایا:

"آپ بہت سارے لوگوں کو پائیں گے کہ وہ محض ذاتی رجحانات کی وجہ سے کسی قوم سے محبت کرتے ہیں اور کسی قوم سے بغض رکھتے ہیں، نہ تو انہیں ان کا معاملہ معلوم ہے اور نہ ہی ان کی دلیل، بلکہ وہ لوگ مطلقاً دوستی کرتے ہیں یا بغض رکھتے ہیں، اس بات کی پروا کیے بغیر کہ آیا وہ نبی ﷺ اور اُمت کے سلف سے صحیح طرح منقول ہیں یا نہیں اور نہ ہی انہیں اس بات کی پروا ہوتی ہے کہ وہ ان کے معنی و مفہوم کو سمجھیں یا ان کے نتیجے و تقاضے کو جانیں۔"[2]

کیا اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں سے محبت اور دوستی کو واجب قرار دیتے ہوئے نہیں فرمایا:

﴿وَمَنْ يَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝۵۶﴾ (المائدۃ:۵۶)

"اور جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اہل ایمان کو اپنا رفیق بنالے، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی جماعت ہی غالب رہنے والی ہے۔"

ان لوگوں نے بت پرستوں کو تو چھوڑ دیا لیکن اہل ایمان سے لڑائی مول لی:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝۴۰﴾ (النور:۴۰)

"اور جسے اللہ نور نہ بخشے اس کے لیے پھر کوئی نور نہیں۔"

---

۱ صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب المساقاۃ و المعاملۃ بجزء من الثمر والزرع، حدیث نمبر ۴۰۴۴

۲ مجموع الفتاوی: ۵/۱۶۳

© rasailojaraid.com